© rasailojaraid.com

ڈاکٹر عالم خوند میری

تشخص کا بحران

تشخص (IDENTITY) کی اصطلاح، ہماری عام زبان کا ایک حصّہ بن گئی ہے جس کو ہم ایک امرِ واقعہ کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ تشخص کا بحران (IDENTITY CRISIS) ہمارے نزدیک عصرِ حاضر کا ایک ایسا المیہ ہے جس کے نقوش ہم اپنے ادب اور فن اور تہذیب کے ہر شعبے میں تلاش کرتے ہیں۔ ہماری یہ تلاش اور جستجو اس بنا پر یکسر بے معنی نہیں ہے کہ جہاں پچھلی ایک صدی میں ہم نے ذات کا عرفان حاصل کیا، وہیں ہم نے اس ذات کو بکھرا ہوا اور منتشر بھی پایا ہے۔ اس انتشارِ ذات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اب ہم ذات کو اس کائنات یا عالم سے جس سے ہم وابستہ اور منسلک ہیں اور جس کے بغیر ذات ایک بے سہارا وجود بن جاتی ہے، بے گانہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ بے گانگی اور عرفانِ ذات ہمارے وجود کے ایسے اجزا بن گئے ہیں جنھیں ہم ایک دوسرے سے جدا کرنے میں اپنے آپ کو ناکام محسوس کرتے ہیں۔ یہ واقعہ صرف دانش وروں کے ایک مختصر سے گروہ تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اب یہ ہر اس فرد کی تقدیر بن گیا ہے جس پر موجودہ تمدن نے کسی نہ کسی طرح براہِ راست یا بالواسطہ اپنا اثر ڈالا ہے۔ الفاظ یا اصطلاحیں بے سبب عام زبان کے جزو نہیں بن جاتیں، زندگی کے تجربات انہیں زبان میں داخل کرتے ہیں اور زندگی کے بہاؤ سے ان میں معانی کا ایک نیا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ایسے الفاظ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں اور ان میں جو جہانِ معانی پنہاں ہے اس کی تلاش کریں۔ اس مختصر مضمون کا صرف یہی مقصود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا نقطۂ آغاز (POINT OF DEPARTURE) کیا ہو؟ یہ سوال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے اہم ہے کہ تشخص جہاں انفرادی شخصیت کا مسئلہ ہے وہیں یہ انسانی اجتماع یا COLLECTIVITY سے بھی وابستہ ہے۔ ان دو مختلف سطحوں پر جہاں چند معانی مشترک ہیں، وہیں یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جہاں گفتگو کی سطح بدلی وہیں نئے معانی اور مفہوم بھی اُبھر آئے یا اُن کے معیار بدل گئے۔ اگر ہم سہولت کی خاطر صرف ایک سطح پر غور کرنے لگیں تو اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم تحلیلیت یا REDUCTIONISM شکار ہوجائیں۔ اس بحث میں اُلجھے بغیر ابتدا ہی میں اس امر کی وضاحت کافی ہوگی کہ ہم فرد اور اجتماع کی علیحدہ وحدتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان میں ایک جدلیاتی ربط کو فرض کرسکتے ہیں اور جماعت کو افراد کا ایک فجائی ظہور یا جدلیاتی EMERGENT قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے یہ بےجا نہ ہوگا کہ ہم فرد کو اپنی بحث کا نقطۂ آغاز بنائیں اور فرد سے اجتماع کی جانب اپنا سفر جاری رکھیں۔

فرد کی زندگی میں تشخص کا مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اچانک سوچنے لگتا ہے میں کون ہوں اور "غیر" سے میرا ربط کیا ہے؟ اگر "غیر" نہ ہو تو شاید یہ مسئلہ ہی پیدا نہ ہو اور زبان میں صیغۂ واحد متکلم بے معنی بن جائے۔ لیکن صیغۂ واحد متکلم کا بھی ایک مقام ہے اور صیغۂ واحد مخاطب اور غائب کا بھی۔ ان میں کامل عینیت نہ صرف زبان کو معدوم کردے گی بلکہ خود عالم یا WORLD کی نوعیت بھی بدل جائے گی۔ اس لیے یہ مفروضہ بے معنی نہیں کہ ان صیغوں میں کامل عینیت کم از کم زیست کی سطح پر موجودہ عالمی نظام (WORLD ORDER) کے منافی ہے۔ "فرد" اور "غیر" دونوں تشخص کے حامل ہیں اور ان دونوں میں ایک ربط بھی ہے۔ بحث کو مختصر کرتے ہوئے صرف یہ وضاحت کافی ہے کہ تشخص اور غیریت (IDENTITY AND OTHERNESS) کی بنیادوں کی تلاش ہم ان دونوں کے علیحدہ حافظوں اور ان کے جداگانہ اجسام میں کرسکتے ہیں۔ وہ جس نے اپنا حافظہ کھو دیا وہ تشخص سے عاری ہوگیا۔ اسی طرح وہ جس نے اپنا جسم معدوم کردیا، وہ بھی تشخص سے بے نیاز ہوگیا۔ میری اپنی انفرادی زندگی بڑی حد تک ان دو جُدا نہ ہونے والے اجزا سے عبارت ہے۔ لیکن یہاں ایک معماتی واقعہ یہ بھی ہے کہ حافظہ اور جسم دونوں کے لیے ثبات اور تغیر "ضروری اور لازمی شرائط یا CONDITIONS ہیں۔ تسلسل کا لفظ ثبات اور تغیر کے حقیقی ربط کا اظہار ہے۔ دوسرے لفظوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

SPATIO-TEMPORAL CONTINUITY یا زمانی و مکانی تسلسل ہی تشخص عطا کرتا ہے اور دو جداگانہ زمانی و مکانی تسلسل، تشخص اور غیریت کی علامتوں کا اظہار کرتے ہیں، اسی لیے یہ دو افراد اپنی الگ الگ سوانح حیات رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تشخص اس ثبات کی علامت ہے جو تغیر کے دوران یا زندگی کے بہاؤ میں موجود رہتا ہے یا اس وحدت کا جو اس سلسلۂ حادثات کو ایک بامعنی ربط کی صورت عطا کرتا ہے۔

اگر ہم پہلے مفروضے کو تسلیم کرلیں تو اس صورت میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اس ثبات کا کوئی وجودی مظہر ہمیں ہاتھ نہیں لگتا، ہم مزید مفروضوں جیسے روح یا آتما کی کھوج میں لگ جاتے ہیں اور عالم سے ہمارا ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ عالم مظہری بن جاتا ہے اور انفرادی زندگی میں سوانح یا اجتماعی زندگی میں تاریخ اپنا مفہوم برقرار نہیں رکھتے، یہاں تشخص عینیت کا مفہوم اختیار کر لیتا ہے اور انسانی زندگی ایک پہلے سے مکمل طور پر لکھی ہوئی کتاب کی ورق گردانی بن جاتی ہے۔ وہ ایک خاص مکان میں اپنا ایک مختصر عرصے کے لیے اظہار کرتی ہے اور پھر ثبات کی نذر ہو جاتی ہے۔ زندگی کے بہاؤ کو معنویت اسی وقت عطا ہوتی ہے جہاں ہم تسلسل کی تلاش، ثبات میں نہیں بلکہ بڑھتی ہوئی گراں تر ہوتی ہوئی اور اضافہ پاتی ہوئی وحدت کو تشخص کی علامت قرار دیں۔ اس مفہوم میں تشخص ایک ایسی وحدت کی شکل اختیار کرتا ہے جو زندگی کے تجربات کو چند اقدار کی روشنی میں مسلسل وحدت عطا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اقدار اور معانی کا ایک نظام تشخص کا دوسرا نام بن جاتا ہے، اور یہی نظام تشخص اور تنوع دونوں پر احاطہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تشخص، تنوع میں وحدت (UNITY AMIDST DIVERSITY) کی علامت بنتا ہے اور ثبات اور تغیر کے جدلیاتی ربط کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس وحدت کے پھیلاؤ کے لیے ایک زمانی و مکانی نظام لازمی شرط ہے اور چونکہ ہر وحدت کا زمانی و مکانی نظام (SPATIO-TEMPORAL ORDER) جداگانہ ہوتا ہے، اسی لیے ہر وحدت اس کائنات میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور کوئی وجود، لوحِ جہاں پر حرفِ مکرّر نہیں بنتا۔ یہی زمانی و مکانی نظام، اور عالم کی تاریخ میں وہ لمحہ جہاں یہ تشخص اپنا اظہار کرتا ہے اس تشخص کی تقدیر یا DESTINY کو متعین کرتا ہے۔ یہی تقدیر ایک شخصیت یا ذات یا PERSONALITY کا تشخص بن جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے لفظوں میں تشخص، اس تقدیر یا DESTINY کا نام ہے جو تاریخِ عالم کے ایک لمحے میں ایک حافظے اور جسم کی وحدت کو اپنی منزل تک پہنچانے میں اور اپنے آپ کو تغیرات کے نظام میں محفوظ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ منزل ہے، تاریخ کی اجتماعی قدروں کی حفاظت کرتے ہوئے نئی قدروں تک پہنچنا اور حاصل کیے ہوئے جہانِ معانی کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک نئے جہانِ معانی کی تخلیق کرنا۔ اس مقام پر یہ دعوٰی بے جا نہ ہوگا کہ ہر فرد امکانی طور پر تشخص تو ضرور رکھتا ہے لیکن حقیقی تشخص اسی وقت ظہور پذیر ہوتا اور عالمِ وجود میں آتا ہے جہاں حافظہ محض ایک یادوں کا انبار نہیں رہتا بلکہ اُس زمانی مکانی نظام کو جس میں وہ اپنا وجود رکھتا ہے، توسیع دینے اور پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تعینات کو توڑتا ہوا نئے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے میں اور ان سے نئی وحدتوں کی تشکیل میں سرگرداں رہتا ہے۔ اگر تشخص صرف محدود گردوپیش کی دُنیا میں سُکڑ جائے تو پھر وہ مقامی یا PAROCHIAL نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور عالم یا آفاق سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ یہ تشخص کا اظہار نہیں بلکہ تشخص کا ٹھہراؤ ہے۔ اس ٹھہراؤ کی دوسری صورت یہ ہے کہ تشخص ماضی یا حال کے ایک لمحے کے اندرون میں مستغرق ہو جائے اور زندگی کے بہاؤ سے بے نیاز ہو جائے۔ دوسری صورت میں وہ ایک منجمد حافظے کی نوعیت اختیار کر لیتا ہے جس کو نفسیاتی تجزیے کی زبان میں طفلانہ رجعت یا INFANTILE REGRESSION کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات وہ واقعہ جس کو ہم تشخص کے بحران یا IDENTITY CRISIS کا نام دیتے ہیں، اسی رجعتِ طفلانہ کا اظہار ہوتا ہے۔ شخصیت زمانے یا تاریخ کے بہاؤ میں اپنی تقدیر کو متعین کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ زمانی مکانی تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، مکان یا مقام (PLACE) بے گانہ نظر آنے لگتا ہے جس کی بیشتر صورتوں میں وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمانی مکانی تسلسل میں مکان یکساں نہیں رہتا۔ انسانی مکان کی غیر یکساں کیفیت (HETEROGENEITY) ہی اس کو طبعی مکان سے ممتاز کرتی ہے جس کی ماہیت HOMOGENEITY ہے۔ مکان پہ زمان یا TIME کے AGGRESSIVE ENCOUNTER کا نتیجہ تاریخ ہے۔ اسی لیے تاریخ صرف زمان سے نہیں بلکہ زمان مکان تسلسل سے تشکیل پاتی ہے۔ اس مقام پہ ہم انفرادی تشخص سے اجتماعی تشخص کی جانب اپنے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔ جس طرح انفرادی تشخص کے لیے کسی روحانی جوہر یا SOUL SUBSTANCE کے مفروضے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح اجتماعی تشخص کے لیے کوئی اجتماعی ذہن (GROUP MIND) یا کوئی پُراسرار اجتماعی جوہر درکار نہیں ہے۔ اجتماعی تشخص (GROUP IDENTITY) اجتماعی تاریخی تہذیبی حافظہ اور کسی اجتماع کے SPATIO-TEMPORAL ORDER زمانی مکانی نظام سے تشکیل پاتا ہے۔

اگر اجتماعی تہذیبی حافظہ، انفرادی حافظے کا COUNTERPART ہے تو مخصوص زمانی نظام انفرادی جسم کا۔ جس طرح انفرادی حافظے کے لیے ایک جسم اور مکان یا PLACE درکار ہے، اسی طرح اجتماعی تہذیبی حافظے کے لیے ایک زمانی مکانی نظام بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

کوئی انسانی AGGREGATE یا مجموعہ اس وقت تک اجتماع یا GROUP کی صورت اختیار نہیں کرتا جب تک کہ ایک تہذیبی حافظہ اس کے پس منظر میں موجود نہ ہو۔ اسی مشترک و تہذیبی حافظے سے اجتماعی تشخص ایک زمانی مکانی نظام میں ایک مخصوص اور قابلِ شناخت پیکر اختیار کرتا ہے اور گمان گزرتا ہے کہ شاید انفرادی ذہن کی طرح کوئی اجتماعی یا گروہی ذہن بھی موجود ہو۔ لیکن مشترک تہذیبی حافظہ افراد کے ایک خاص زمانی مکانی نظام میں تسلسل کا نتیجہ ہے، کوئی پُراسرار وجود نہیں۔ انفرادی حافظے کی طرح مشترک تہذیبی حافظہ بھی گہری ہوتی ہوئی، گراں تر ہوتی ہوئی اور وسیع تر ہوتی ہوئی وحدتوں کو اپنے اندر سمیٹتا اور اس عمل میں زمانی مکانی نظام کو بھی وسیع تر کرتا ہے۔

یونانی تہذیب کے آغاز سے بیسویں صدی کے آخری دور تک مغربی تشخص (WESTERN IDENTITY) اس عمل کی ایک نمایاں مثال ہے۔ قومی اور گروہ واری رقابتوں، باہمی جنگ و جدل، کشت و خون اور تیز رفتار سماجی معاشی تبدیلیوں کے باوجود اور انسانی تنوع کے باوصف مغرب اپنی ایک IDENTITY یا تشخص رکھتا ہے۔ یہاں اس تشخص کے عوامل ترکیبی سے بحث نہیں صرف اس امر کی جانب اشارہ مقصود ہے کہ مخصوص تہذیبی حافظہ اور مخصوص زمانی مکانی نظام اور ان دونوں کا تعامل ایک ایسے تشخص کو جنم دیتا اور برقرار رکھتا ہے جس کی شناخت یا IDENTIFICATION میں ناقابلِ حل مشکل پیش نہیں آتی۔ یہ تشخص، تنوع میں وحدت یا متنوع تشخص کی ایک مثال فراہم کرتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر اجتماعی تہذیبی حافظہ طاقت ور رہا اور اس کو شکست [illegible] تو تشخص خود کشیدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تشخصات یا PLURAL IDENTITIES کو اپنے اندر محفوظ رکھ سکتا ہے اور ان میں ایک جدلیاتی ربط برقرار رہ سکتا ہے ۔ یہ جدلیاتی اتحاد در تضاد (UNITY OF OPPOSITES) کی ایک تاریخی علامت بن جاتا ہے ۔

یہاں اس امر سے انکار نہیں کہ ارضی قومیت (TERRITORIAL NATIONALISM) نے اس تشخص کو بار بار دھچکا پہنچایا ہے، لیکن ایک مشترک تہذیبی ورثے کے شعور نے اس تشخص کو مکمل طور پر منتشر ہونے سے بچایا۔ صنعتی انقلاب اور ایک مشترک ٹیکنولوجیکل نظام خود اس مشترک تہذیبی ورثے کے اجزا بن چکے ہیں ۔ لیکن یہاں ایک اہم نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مغرب صنعتی انقلاب سے نہ گذرا ہوتا اور مشترک ٹیکنولوجیکل نظام نہ ابھرا ہوتا تو کیا اجتماعی تہذیبی حافظہ، زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ سکتا؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ مغربی تشخص کے یہی دو اجزا یعنی صنعتی انقلاب اور مشترک ٹیکنوجیکل نظام زمانی تسلسل یا SPATIO-TEMPORAL ORDER یا CONTINUITY کی علامتیں ہیں ۔ اسی لیے مغرب میں رجعت طفلانہ کا، جس کو صحافتی زبان میں احیا پرستی کہا جاتا ہے، امکان کم نظر آتا ہے۔ بات کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک اشارہ کافی ہے۔ سرمایہ داری نظام کا بحران مغرب کو فیڈرل نظام کی جانب بھٹکائے گا نہیں، کیونکہ بالآخر سرمایہ داری نظام اور کمیونزم دونوں مغربی تشخص کے تنوع کی مثالیں ہیں اور EURO COMMUNISM اس تنوع کی ایک تخلیقی علامت ۔

مشرقی تشخص ایک دوسری صورتِ حال کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ایک عرصۂ دراز تک یہاں تشخص اور ثبات مرادف قرار دیے گئے ۔ مشرق کے مختلف حصوں میں جو تہذیبی تصور نظر آتا ہے اور جس کو عام طور پر تشخص کے بحران کا نام دیا جاتا ہے، وہ ایک اعتبار سے معانی کے اسی انتشار یا گنجلک کا نتیجہ ہے ۔ یہاں تہذیبی حافظہ تو رہا لیکن حافظہ صرف ماضی کے تجربات کی حفاظت کے مترادف قرار پایا، وہ بڑھتی ہوئی وحدتوں کا اظہار نہیں بنا ۔ زمانی مکانی نظام تو تھا لیکن زمان پر مکان کا تسلط رہا اور ذہن کی حکمرانی۔ زمانی مکانی نظام نے ایک تسلسل میں اظہار نہیں پایا، ایک جامد نظام میں محصور رہا ۔

اقبال نے اپنے ایک خطبے [illegible] کے جدلیاتی ربط اور اُن کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصادم پر ان لفظوں میں اظہارِ خیال کیا ہے:

"اسلام کے نزدیک حیات کی روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے، جسے ہم اختلاف اور تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے اس تصور پہ مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونے چاہییں جو حیاتِ اجتماعیہ میں منظم و انضباط قائم رکھیں کیونکہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں، ہم اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہیں تو دوامی اصولوں ہی کی بدولت۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ اس لیے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ اس صورت میں تو ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے، حرکت سے عاری کر دیں گے۔ اصولِ اوّل کی تائید تو سیاسی اور اجتماعی علوم میں یورپ کی ناکامیوں سے ہو جاتی ہے۔ اصولِ ثانی کی عالمِ اسلام کے پچھلے پانچ سو برسوں کے جمود سے، جو اگر ٹھیک ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی ہئیتِ ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے۔؟ اس کا جواب ہے۔ اجتہاد"۔ (چھٹا خطبہ)

اقبال نے جن لفظوں میں اسلام اور مغرب کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ شاید آج کے اسلامی مشرق کی پوری طرح عکاسی نہیں کرتیں بلکہ مغرب کی تصویر کچھ حد تک مسخ شدہ (DISTORTED) نظر آتی ہے۔ اس سے ہٹ کر "ابدی اصول" کی اصطلاح بھی ذرا سی ترمیم طلب ہے، اس کے بجائے ہم ABIDING PRINCIPLES کی ترکیب استعمال کریں تو اسلامی مشرق اور مغرب میں ایک حد تک یکسانی نظر آتی ہے۔ دونوں ان اصولوں کے حامل ہیں لیکن ایک نے ان اصولوں اور تغیر کے جدلیاتی ربط کو پا لیا ہے اور دوسرے نے اب تک اس میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے، اسی لیے مغرب میں تو ہمیں تشخص کا بحران نظر آتا ہے لیکن جہاں تک مغرب کے ترقی یافتہ سماج کا سوال ہے عوامی ادارات (INSTITUTIONS) کے ذریعے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گروہی تشخص کے تصادم پر بڑی حد تک قابو پالیا گیا ہے۔ اقبال کے بعد مشرق اور خصوصاً اسلامی مشرق مسلسل تغیر کا مقابلہ کر رہا ہے، جس کا اقبال نے خطبات کے بعد کی شاعری میں اظہار کیا ہے۔ مثلاً (ساقی نامہ) لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اسلامی مشرق نے آج تک دیرپا اصولوں اور تغیر کے درمیان ربط کے عرفان میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ اس کی ایک مثال اسلامی اور غیر اسلامی مشرق کے تقابل میں بڑی حد تک واضح ہوتی ہے۔

اگر یہاں ہم بحث کو DISTORTION (انحراف) سے محفوظ رکھنے کے لیے صرف ان غیر اسلامی سماجوں پر نظر رکھیں، جنھوں نے غیر کمیونسٹ (NON-COMMUNIST) راستے کو اپنایا ہے تو شاید مسئلہ بڑی حد تک واضح ہو جائے۔ غیر اسلامی اور اسلامی سماج دونوں کسی نہ کسی طرح تشخص کے بحران کا شکار ہیں کیونکہ ان دونوں سماجوں میں تہذیبی حافظے کے شعور اور زمانی مکانی تسلسل کے درمیان ربط ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ بحث کو واضح کرنے کے لیے ایک طرف ہندوستان کا تہذیبی نقشہ سامنے رکھ سکتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی مشرق کا۔ پہلی مثال میں ہم ایک اہم ABIDING PRINCIPLE وحدت یا UNITY کا ہے اور دوسری طرف دین کی جامعیت کا، پہلی مثال میں اہم مسئلہ وحدت در تنوع (UNITY IN DIVERSITY) کے اصول کی حفاظت ہے تو دوسری طرف معاملہ تنوع کے انکار کا۔ پہلی مثال میں حل یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمہ اداروں جیسے وفاقی تشکیل یا FEDERAL STRUCTURE کی اس طرح توسیع کی جائے کہ وہ ان تنوعات یا DIVERSITIES کو اپنے اندر سمو سکے اور ہر گروہ اپنے تہذیبی حافظے اور مکانی زمانی تسلسل کو ٹوٹتا ہوا محسوس نہ کرے، یا وفاقیہ یا FEDERALISM کے تصور میں ایسی لچک پیدا کی جائے کہ وحدتوں کو ذیلی قومیتوں کی نوعیت عطا کر سکے اور عظیم تر ارضی وحدت یا GREATER TERRITORIAL UNITY کو ایک ابدی اصول کا درجہ نہ دیا جائے۔ اس مثال میں مسئلہ یا PROBLEM ارضی قومیت کو جسے اقبال نے EARTH-ROOTEDNESS کا نام دیا ہے اور تہذیبی وحدتوں کے درمیان تصادم کا ہے اور ان کے حل کے لیے پچھلی تاریخ سے نہیں بلکہ عصر حاضر کے تجربات سے جن کا اظہار اداروں میں ہوتا ہے، مدد لی جا سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

لیکن اسلام میں صورتِ حال مختلف ہے، یہاں تصویر کا فی پیچیدہ اور فن کی زبان میں SURREALISTIC نظر آتی ہے۔ فرد اور گروہ دونوں ماضی کے جبر کا شکار ہیں۔ ایک طرف وہ جنھیں ابدی اصول کہا جاتا ہے فرد کی تخلیقی صلاحیتوں پر روک لگاتے ہیں تو دوسری طرف گروہوں کی نئی آرزوؤں اور تمناؤں کو ابدی اصولوں سے انحراف کا نام دیا جاتا ہے۔ اقبال کی بصیرت اسلام کے صرف غیر ارضی پہلو پر مرکوز رہی اور اس نے فرد اور گروہ کی زندگی کے دوسرے اصول PLACE کو کم تر اہمیت کا مستحق قرار دیا۔ ہر چند اقبال نے اپنے اسی خطبے میں ارضی قومیت سے مصالحت کی کوشش کی ہے لیکن تبدیلی کے جس اصول کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی اجتہاد وہ بھی ایک اعتبار سے حال کا حل، ماضی میں تلاش کرنے کے مرادف ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی دُنیا یا اس کے مختلف حصّے خود ایک مستقل تشخص یا IDENTITY کے حامل ہیں یا ایک MONOLITHIC IDENTITY کی تصویر فراہم کرتے ہیں، جس امر کو ہم اسلامی تشخص قرار دیتے ہیں وہ خود ایک CLUSTER OF IDENTITIES ہے، ایسے تشخصات کا جن کے تہذیبی حافظے بھی جدا ہیں اور SPATIO-TEMPORAL CONTINUITY بھی مختلف۔ اسی لیے اجتہاد کے ادارے یا تصور کو مشکل سے ہی تغیر[۳۱] اور تشخص کے تصادم کا حل قرار دیا جا سکتا ہے، سُنّی اسلام پر کسی نہ کسی طرح علما کی گرفت برقرار رہے گی اور شیعہ اسلام، امامت فقیہ کے تصوّر میں اسیر رہے گا۔ یہاں اقبال کی بصیرت کچھ دور تک ہی ہماری رہنمائی کر سکتی ہے، لیکن خود ماضی کے پیدا کردہ تضادات میں گھر جاتی ہے۔ اقبال نے نئے دور کی آواز سُنی تھی جس کی جھلک ہمیں اسی کے خطبے میں نظر آتی ہے، لیکن اس نے حل ماضی کے ایک INSTITUTION میں تلاش کیا۔ اس مضمون کا ایک پیش مفروضہ (PRESUPPOSITION) یہ ہے کہ اسلامی سماج کے لیے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کا کوئی ایسا حل تلاش کرنا آسان نہیں ہے جس کو ہم اسلامی حل کا نام دے سکیں۔ اسی لیے حسب ذیل PROPOSITIONS پر نظر رکھنا ہوگی:

۱۔ اس وقت کوئی ایسا وجود نہیں ہے جس کو ہم قطعی معنوں میں اسلامی دُنیا کا نام دے سکیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲- جس خطۂ ارض کو ہم اصطلاحی آسانی کی خاطر اسلامی دُنیا کا نام دیتے ہیں وہ خود کئی دُنیاؤں کا مجموعہ ہے۔

۳- اسلام کے ABIDING اصول اس کے قانونی نظام میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے بلکہ اُنہیں اس کے اخلاقی اور روحانی VISION میں ڈھونڈا جانا چاہیے جن کا اظہار متنوع ادارات میں ہو سکتا ہے۔

۴- اسلام ایک توانا اخلاقی نظام تو عطا کر سکتا ہے لیکن کوئی نیا عالمی نظام یا WORLD ORDER فراہم نہیں کر سکتا۔

ان مفروضوں کی روشنی میں اسلامی تشخص یا ISLAMIC IDENTITY اپنا اظہار مقامی یا مکانی تنوعات ہی میں کر سکتا ہے۔ ارضی قومیت جس کو اقبال نے EARTH-ROOTEDNESS کا نام دیا ہے اس وسیع تر اسلامی تشخص کے لیے ایک ضروری شرط ہے، تمدن صرف زمانی CATEGORY نہیں ہے، زمانی مکانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک STRUCTURE ہے اور ہر STRUCTURE مکان یا PLACE کا متقاضی رہتا ہے۔ خود اقبال کو جس نے اپنی شاعری میں قومیت کے تصور کے خلاف اپنی شاعرانہ آواز بلند کی تھی، خطبات میں اس اصول کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس لیے کہ وہ خطبات میں RIGOROUS فلسفیانہ فکر کر رہا تھا۔ اس نے جب فلسفیانہ فکر کی تب محسوس کیا کہ اسلامی تشخص محض روحانی اصول کے طور پہ کارفرما نہیں رہ سکتا۔ اس کی شناخت یا IDENTIFICATION کے لیے قومیتوں کا STRUCTURE ضروری ہے، اور وہ اپنا اظہار مختلف صورتوں یا قالبوں ہی میں کر سکتا ہے۔ تہذیبی حافظہ، محض آفاقی یا COSMOPOLITAN نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف زمانی تسلسل میں محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کے تاریخی بننے کے لیے مخصوص مکانی نظام بھی ایک لازمی شرط ہے۔ تاریخ دراصل SPACE-TIME STRUCTURE ہے اور اسی لیے کوئی بھی مفکر جو RIGOROUS THINKING کرنے پہ مائل ہو، اس STRUCTURE سے اپنے آپ کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اقبال کی سیاسی فکر کا وہ لمحہ بڑا اہم ہے جب اس نے اسلام کی روح کی بازیافت کے لیے ایک مخصوص خطۂ ارض کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورت کو محسوس کیا - ایک اعتبار سے یہ لمحہ ان شاعرانہ لمحات کا انکار ہے جب اس نے مردِ مومن کے لیے دلّی، اصفہان اور سمرقند کی شرط سے انکار کیا تھا۔ فکری اعتبار سے یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ جہاں نفسی کیفیت زمانی دوراں یا DURATION میں کشف حاصل کرتی ہے وہیں تمدنی یا تاریخی فرد ایک STRUCTURE کا طالب ہوتا ہے جس کے لیے PLACE درکار ہے، اسی لیے شخصیت کے قومی اور علاقائی پہلوؤں میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے -

اقبال کا دوسرا اہم فکری تقاضا جس کو اس نے فرد کی روحانی یا نفسی آزادی SPIRITUAL EMANCIPATION کا نام دیا ہے، ایک اور سمت کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنی روحانی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ایک SUPER-IMPOSED جماعت یا اجتماع سے جس کا کوئی ارضی مرکز نہیں ہے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرے - مختصر لفظوں میں 'روحانی آزادی' فرد اور ایک بین الاقوامی اُمّت کے تضاد کا شکار بن جاتی ہے۔ خودی کے اسرار بے خودی کے رموز کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خطبات میں اقبال نے بالآخر امت کو ایک LEAGUE OF NATIONS کا STATUS عطا کرنا چاہا، لیکن اگر ہم اس تاریخی واقعہ کو اپنی نظر کے سامنے رکھیں کہ اسلامی تشخص، تاریخ کے بہاؤ میں متضاد اور متصادم تشخصات کی ایک مثال ہے تو اس صورت میں جمعیت اقوام کا یہ تصور کسی روحانی تقاضے کی تکمیل یا تشفی نہیں کر سکتا۔

اقبال نے اس بات کا اعتراف تو نہیں کیا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے غیر شعوری طور پر اسلامی دُنیا کے لیے ایک غیر قومی کلیسا کی ضرورت کو فرض کر لیا تھا۔ لیکن اسلام کی صورت میں، ایسی جمعیت اقوام وہی فرائض انجام دے گی جو کوئی دوسری علاقائی جمعیت کر سکتی ہے اس لیے اس کے وسیلے سے ایک آفاقی یا کلی اسلامی تشخص کی ضمانت حاصل نہیں ہو سکتی۔

جب اقبال نے اپنے اسی خطبے میں، جس کی طرف پچھلے صفحوں میں اشارہ کیا گیا ہے، ریاست اور دین کی جدائی کے اصول سے مصالحت کر لی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اسلامی تشخص کے لیے ایک روحانی اخلاقی اصول کو کافی تصور کر لیتا اور ISLAMIC POLITY کے غیر تاریخی تصور سے دست کش ہو جاتا۔ اس صورت میں پہلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چار خطبات میں انسانی فرد کے روحانی ارتقا کی جو سمت متعین کی تھی اور جس کے لیے راہ دریافت کی تھی اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ آسان لفظوں میں 'اسلامی فرد' کسی بھی ارضی تشخص کا پابند ہوتے ہوئے وجدان اور کشف کی سمت میں گام زن ہو سکتا ہے، اور یہی اسلامی صوفیا کا راستہ تھا۔ اس صورت میں اقبال کا مثالی فرد ایک نیا روحانی تشخص کرتا جو صحیح معنوں میں EARTH-ROOTEDNESS سے آزاد ہوتا اور ایک معتبر آفاقیت کا حامل ہوتا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ خود اقبال کی IDENTITY کئی IDENTITIES کا مجموعہ تھی اور ان میں سے ہر IDENTITY اپنا حصّہ طلب کر رہی تھی۔

بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کا عطیہ

(BCCI FOUNDATION)

نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کو کچھ عرصہ قبل ایک لاکھ سینتیس ہزار روپے عنایت کیے تھے، اس رقم سے فوٹو کاپی مشین خریدی گئی تھی۔ اور کمپیوٹر کا سامان بھی خریدا گیا تھا۔ اب اس فاؤنڈیشن کے اصحابِ اختیار کی طرف سے ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی خطیر رقم عنایت کی گئی ہے۔ فاؤنڈیشن کا مقصد یہ ہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ اطمینانِ قلب اور دلجمعی سے اپنے مقدس مشن کو جاری رکھ سکے۔

فاؤنڈیشن کے اس گراں قدر عطیے پر ہم اس کے اربابِ انتظام کے تہِ دل سے شکر گزار ہیں

(ادارہ)

© rasailojaraid.com